OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

Al-Qamar, Volume 5, Issue 1 (January-March 2022)

اردو افسانے میں تقسیم ہند کا مذہبی، سیاسی اور سماجی منظر نامہ: منٹو کی افسانہ نگاری کا ایک مطالعہ

Religious, Political and Social Scenarios of Partition of India in Urdu Fiction: A Study of *Manto's* Fiction

Syeda Humera Abid
Visiting Lecturer, Department of Urdu University of Mianwali
Sarwar Azeem
Incharge Department of Urdu, Thal University Bhakkar

Abstract

Sadat Hassan Manto is known as leading and renowned short story writer. He earned lot popularity through his unique writings and. He was badly criticized in the literary circles throughout his life but he depicted the real picture of the women of the society particularly, and done his job very successfully. In this article his ideas about the partition are highlighted as per his conviction towards Indo-Pak division in the history. It is proved in the article that he was justified his idea about humanity and social moral values of the society which was much more acknowledged after his death and he is known as worldwide famous writer in the history of literature. In this paper his valuable status is being described in the light of his writings.

Key words: Partition of India, Religious, Political and Social Scenario, Urdu Fiction, *Manto*

تقسیم ہند سیاسی و سماجی منظر نامہ

لفظ انقلاب کہنا بہت آسان ہے۔ لیکن دیکھنا اور انقلابی مراحل سے گزرنا بہت مشکل ہے۔ دنیا میں جتنے بھی انقلاب آئے تمام خون کی ندیاں اور انسانی سروں کے مینار لے کر آئے۔ بلکل یہی حال 1947ء کے انقلاب کا تھا اس انقلاب میں لاکھوں جانیں برباد ہوئیں اور لاکھوں عزتیں تار تار ہوئیں دل خون کے آنسو روتا ہے پھر بھی جگر تھام کر اگر ان داستانوں کو اکھٹا کیا جائے تو وہ داستانیں بھی لاکھوں ہی ہوں گی۔ 1947ء کے بعد ہندو مسلم فسادات کی آگ تیزی سے بھڑک اُٹھی تھی۔ لاہور اسمبلی کی سیڑھیوں پر ننگی تلوار پر لہرا کر ماسٹر تارا سنگھ نے یہ اعلان کر دیا کہ سکھ پاکستان کبھی بننے نہیں دیں گے مشرقی پاکستان کے گلی

CC BY

کوچے پھر بھی پاکستان زندہ باد کے نعرے تھر ارہے تھے۔ 1947ء کے آواخر آگ اور خون میں لتھڑے ہوئے دن تھے۔ مسلمانوں کے گھروں کو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ گلیوں نالوں اور سڑک پر پڑی ہوئی لاشوں کو گدھ اور کتے نوچ رہے تھے۔ مسلمانوں کے محلوں کے محلے ویران ہو چکے تھے۔ لوگ اپنا سب کچھ لٹا کر کیمپوں میں دم بخود بیٹھے تھے اپنی جانیں بچانے کو یہ لوگ ننگے سر پاؤں گھروں سے بھاگے تھے۔ ہزاروں ماؤں کے لال ہندوستان میں بے گوروکفن رہ گئے تھے۔ لاکھوں گھروں کی عصمتیں چوراہوں پر تار تار ہوئیں روزانہ ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے۔ وحشی بلوائیوں کی بربریت کی عصمتیں بچانے کو معصوم و بے بس عورتوں نے خود اپنے سینوں میں خنجر اتارے اور کنوؤں میں چھلانگیں لگائیں۔ جو لوگ بلوائیوں سے جانیں بچا کر مہاجر ٹرینوں پر سوار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان میں سے بھی سینکڑوں منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے ہندو اور سکھ بلوائی رات کی تاریکی میں ان ٹرینوں پر حملہ کر دیتے اور معصوم، بے گناہ، نہتے لوگوں کو اپنی بربریت کا شکار بنا دیتے۔ حکیم محمد طارق محمود لکھتے ہیں: "نومبر 1947ء شام واہگہ ریلوے اسٹیشن پر مسلمانوں کا جسم غضیر ہندوستان سے آنے والی مہاجر ٹرین کا خوشی اور بیتابی سے انتظار کرتے ہوئے جوش سے نعرے لگا رہا تھا -------- ٹرین آکر رکی -------- پر کوئی ذی روح ٹرین سے بر آمد نہ ہوئی۔ لوگوں نے تو کھڑکیوں سے جھانکا اور چیختے ہوئے پیچھے ہٹے۔ کرپانوں سے کٹے ہوئے گلے گولیوں سے چھلنی سینے، جسم سے علیحدہ ہوئے بازو، پھٹے ہوئے پیٹ، خون میں لت پت کئی پٹھی لاشیں ظلم و تشدد کی المناک داستاں سنا رہی تھیں"[1]

تقسیم ہند ایک ایسا سانحہ تھا کہ ہر دل خون کے آنسو رویا ہر آنکھ اشکبار ہوئی۔ انسانی جانوں کا اس سفاکی اور بے رحمی سے ضیاع نا قابل فراموش امر تھا اس المناک سانحہ سے نہ صرف عام انسانوں کی زندگیاں متاثر ہوئیں۔ بلکہ ادب اور اس سے تعلق رکھنے والے ہر حساس دل فرد پر اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ ہر شاعر و ادیب نے اس خونریز سانحہ پر قلم اٹھایا اور انسان اور انسانیت کی اس پامالی پر لہو رویا۔ ایک قلم کار کے ذہن عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ سماج میں پیش آنے والے واقعات کو اپنے قلم سے نہ صرف تاریخ کا حصہ بناتا ہے بلکہ اس کو ایک نئے اسلوب میں پیش کر کے عام انسانوں کو بھی سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ تخیل ہو یا محاکات دونوں کو استعمال میں لا کر قلم کار سماجی روایت، انسانی چال چلن، آپسی رشتہ، میل ملاپ، لڑائی جھگڑا وغیرہ کی خوب ترجمانی کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہمارے قلم کاروں خاص کر اردو زبان میں لکھنے والوں نے تقسیم ہند کے ایک ایک حادثے کو قلم بند کیا ہے۔ فرمان فتح پوری اس حوالے سے لکھتے ہیں: "اس دور میں اپنوں کی بے حسی و بے غیرتی، بد نظمی و بد عنوانی لوٹ کھسوٹ، جبر و ظلم اور ناانصافی و ناعاقبت اندیشی پر مبنی موضوعات اردو افسانے میں عام ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ مہاجرت و فسادات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی واقعات بھی افسانہ نگاروں کی توجہ کا مرکز بنے"[2]

برصغیر کی تاریخ میں تقسیم ہند کا سال خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ 1947ء میں ہندوستان کو مدتوں بعد غلامی کی زنجیروں سے رہائی تو میسر ہوئی تھی مگر ساتھ ہی تقسیم ہند کے واقعات ایک سوگوار فضا قائم کر دی تھی۔ غم و غصہ کا عالم یہ تھا کہ انسان نیک و بد کی تمیز بھول بیٹھا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ صبح آزادی اپنے دامن میں خون خرابے، ہجرت و فسادات مذہبی منافرت اور انسانیت سوز واقعات لے کر آئی تھی۔ تقسیم ہند کا واقعہ بذات خود ایک عظیم سانحہ تھا ساتھ ہی اس کا شدید ردعمل فسادات کے طور پر سامنے آیا اور قتل و غارت گری کی وہ داستان رقم ہوئی جس سے تاریخ کے اوراق چھلنی ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ "فیض" نے اسے "شب گزیدہ سحر" کہا ہے۔ ایک قوم کے لوگ دوسری قوم کے لوگوں کی عزت اور خون کے پیاسے ہو گئے تھے ایک طرف

ہندوستان میں بس رہے مسلمان اپنا گھر اپنی جائید ادیں یہاں تک کہ اپنے عزیزو اقارب کو چھوڑ کر پاکستان ہجرت کر رہے تھے، دوسری جانب پاکستانی خطے میں بس رہے ہندو اور سکھ جائے پناہ ڈھونڈنے کے لیے عجلت میں ہندوستان کا رخ کر رہے تھے۔ ایسے نازک حالات کا اثر انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں آئے نظم ہو یا نثر ناول ہو یا افسانہ تقسیم و فسادات سے اپنے پر خوں داستانوں کو نہ صرف قلمبند کر رہے تھے بلکہ اپنی تحریروں سے ذہن سازی کا کام بھی کر رہے تھے۔ تقسیم ہند اور اس موقع پر لاکھوں انسانوں کی ہجرت ایک ایسا موضوع ہے۔ جس پر اردو ادب میں کئی ایسی تخلیقات سامنے آئیں جو اس دور کی سیاسی، معاشی اور سماجی تاریخ کے ساتھ اس وقت کے حالات کی لفظی جھلکیاں اور عکس ہیں۔ پاک و ہند کے ادیبوں نے تقسیم اور ہجرت کے موضوع پر کئی افسانے کہانیاں اور ناول لکھے اور یہ تخلیقات نہایت پر اثر اور دردناک ہیں۔

تقسیم ہند اور اردو افسانہ

تقسیم جیسے المناک سانحہ کا اثر جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں نظر آیا۔ ادب کے میدان میں بھی اس کے گہرے اثرات نظر آئے نظم ہو یا نثر ناول ہو یا افسانہ تقسیم و فسادات پر لکھنے کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ ہمارے ادیبوں نے اپنے قلموں سے ان پر خون داستانوں کو قلمبند کیا۔ ان تحریروں کو پڑھنے کے بعد بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصنفین نے انسانی المیوں کی چبھن دل میں لیے جو ادب تخلیق کیا وہ بیش قیمت سرمائے سے کم نہیں۔ تقسیم ہند کے بعد افسانہ نگاری بھی قدرتی طور پر ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ اس تقسیم نے صرف ملک کو ہی نہیں افسانہ نگاروں کو بھی دو الگ الگ ممالک میں تقسیم کر دیا۔ فسادات کے موضوع پر بہت سے افسانے لکھے گئے جو بالعموم تین اقسام پر مشتمل ہیں۔ ایک وہ جو اس خونی ڈرامے سے جنم لینے والی کہانیوں کو بنیاد بنا کر لکھے گئے۔ جس میں ظلم، بربریت، لوٹ مار اور جنسی استحصال کا ذکر ملتا ہے۔ یہ افسانے واقعاتی تھے جس میں افسانویت نہیں تھی اور جو سنسنی خیزی پیدا کرنے کے لیے لکھے گئے۔ دوسری قسم کے افسانوں میں ہر دو جانب سے کیے گئے ظلم و ستم کی کہانیاں لکھی گئیں۔ یہ افسانے ادیبوں کی جانبداری کا پروپیگنڈا قرار دیے جا سکتے ہیں۔ "قدرت اللہ شہاب" کے افسانے اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں ان افسانوں میں ہجرت کے مظالم کی یکطرفہ کہانیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ تیسری قسم ان افسانوں کی تھی جو وقتی اور حادثاتی ہونے کے باوجود نا صرف افسانوی تاثیر رکھتے ہیں بلکہ فکری گہرائی، انسانی نفسیات کی آگاہی اور زندگی کی پیچیدگیوں کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، قراۃ العین حیدر، رام لعل شوکت صدیقی، ڈاکٹر انور سجاد، قدرت اللہ شہاب، انتظار حسین، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور بعض دیگر افسانہ نگاروں کے نام اہم ہیں۔

تقسیم ہند منٹو کی نظر میں

برصغیر کی تقسیم سے متعلق سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ بالخصوص ایسے افسانے جو پاک و ہند کی تقسیم کے تناظر میں لکھے گئے انہیں منٹو کے شاہکار افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ تاریخ کا عجب المیہ ہے کہ بعض ناقدین نے منٹو کی چند تحریروں کو فحش نگاری کے زمرے میں زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے لیکن یہ امر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بے معنی ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا منٹو کی افسانہ نگاری اپنے وسیع تر تناظر میں گہرے معاشرتی اور سماجی شعور کی حامل قرار پاتی ہے۔ جب کہ تقسیم ہند اور فسادات پر لکھے ہوئے افسانے اسکا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ تقسیم ہند کی ایک زندہ مثال سعادت حسن منٹو کے شاہکار افسانے ہیں۔ ان کے کئی افسانوں میں فسادات کا موضوع چھیڑا گیا ہے۔ اردو ادب میں اگر اس دور سے جڑے

انسانی المیوں کی حقیقی لفظی جھلکیاں کسی نے پیش کی ہیں۔ تو وہ سعادت حسن منٹو ہیں۔ سعادت حسن منٹو کا نام اس دور کے ادیبوں، افسانہ نگاروں میں سر فہرست ہے جنہوں نے وہ سب واقعات انسانیت کا وہ وحشی روپ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور نہ صرف دیکھا بلکہ پوری شدت سے محسوس کیا اور اپنے قلم سے صفحہ قرطاس پر اتارا۔

منٹو کے افسانے انسانوں کی اس وحشت، بربریت اور مظالم کی داستانوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ منٹو نے انسان کو انسانیت کے درجے سے گرتے دیکھا محبت کو نفرت میں دوستی کو دشمنی میں بدلتے دیکھا، عزتوں کو پامال ہوتے اور گھروں کو خاکستر ہوتے دیکھا ہے۔ اور یہ سارا درد اس کے افسانوں سے چھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ منٹو نے تقسیم ہند اور فسادات کے موضوع پر اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ اور مجموعی طور پر موثر افسانے لکھے۔ فسادات کے موضوع کے ساتھ خون آلود انسانیت کی جذباتی وابستگی بھی تھی۔ جس نے منٹو جیسے عظیم فنکار کے بھی بعض اوقات قدم ڈگمگا دیے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ کچھ ایسے افسانے بھی ہیں جو فن اور موضوع کے امتزاج کا دلکش نمونہ ہیں۔ اور ادب میں ان کا ایک اہم مقام ہے۔ نگت ریحانہ خان اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ: "سیاسی، معاشرتی، دینی، نفسیاتی اور اخلاقی مسائل کو پہلے مختلف زاویوں سے دیکھتے تب اسے افسانے کے فارم میں ڈھالتے"[3] کہانی کار جس زمین پر بیٹھ کر لوگوں کو قصہ سناتا ہے اس کے لیے اچھے موسم کا خواب اور آرزو اس کی آنکھ اور دل میں ہوتی ہے مگر کوئی صرف مدہوش کرتا ہے اور کوئی جھنجوڑتا ہے۔ کہ اچھی تعبیریں رت جگوں کے عوض ملتی ہیں۔ اردو افسانے میں جب بھی حق، انصاف کی خاطر بے باکی اور مزاحمت، ریاکاری کے خلاف للکار انسانیت سے لگاؤ کے بلند آہنگ اقرار اور آزادی اظہار کا ذکر ہوتا ہے، سعادت حسن منٹو کا حوالہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ بلکہ میں اگر کہوں کہ اردو افسانے کو منٹو نے ہی یہ لہجہ سکھایا تو یہ مبالغہ نہ ہو گا۔ سعادت حسن منٹو کے فکر و فن کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تخلیقی ارتقاء کی اہم منزلوں کو مد نظر رکھا جائے۔ منٹو نے اپنے تحقیقی سفر کا آغاز دہشت پسندی کا خواب دیکھنے والے ایک نیم پخت انقلابی کے طور پر کیا، باری الیک کی زیر ہدایت مہم جوئی کے منصوبے بنائے گئے۔ کمرے کو 'دارالاحمر' کا نام دے کر بھگت سنگھ کا مجسمہ ہی نہیں سجایا گیا بلکہ 'وکٹر ہیوگو' اور 'آسکر وائلڈ' کے تراجم کے حوالے سے سنسنی خیز اور جذباتی پوسٹر بھی خود لکھ کر امرت سر کی دیواروں پر لگائے گئے۔ یہ زمانہ برصغیر میں قوم پرستانہ جذبات کے عروج کا زمانہ ہے اور اسی آتشی زمانے میں منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ 'آتش پارے' منظر عام پر آتا ہے 'آتش پارے' کا عنوان ہی انقلابی رومانویت اور ہنگامی اشتعال کو ظاہر کرتا ہے۔ رہی سہی کسر یہ مختصر دیباچہ پوری کرتا ہے۔ "یہ افسانے دبی ہوئی چنگاریاں ہیں ان کو شعلوں میں تبدیل کرنا پڑھنے والوں کا کام ہے۔" جلیانوالہ باغ کا سانحہ (1919ء) جب رونما ہوا تو منٹو سات برس کا بچہ تھا مگر اس سانحے کی اثر آفرینی دیکھیے کہ منٹو کا پہلا افسانہ 'تماشہ' ہی اس حادثے کے بارے میں ہے اور یہ عمل اتنا ہی معنی خیز ہے کہ منٹو نے اس افسانے کے مرکزی واقعے کو بچہ کے نظر سے دکھایا ہے۔ "اب، اسے یقین ہو گیا کہ فضا کا غیر معمولی سکون، طیاروں کی پرواز، بازاروں میں مسلح پولیس کا گشت، لوگوں کے چہروں پر اداسی کا عالم اور خونی آندھیوں کی آمد کسی خوفناک حادثے کی پیش خیمہ تھیں۔"[4] "اللہ میاں! میں دعا کرتا ہوں کہ تو اس ماسٹر کو جس نے اس لڑکے کو پیٹا ہے، اچھی طرح سزا دے اور اس چھڑی کو چھین لے جس کے استعمال سے خون نکل آتا ہے۔"[5] 'دیوانہ شاعر' نسبتاً کمزور افسانہ ہے مگر اس میں جلیانوالہ باغ ہی کے سانحے پر زیادہ کھل کر باتیں کی گئی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ آئندہ لائحہ عمل بھی تجویز کیا گیا ہے۔ ایک آدھ جگہ افسوس بھی ہوتا ہے جب منٹو 'تماشا' میں لکھے ہوئے اس جملے کو اس افسانے میں بھی دہراتا ہے۔

"موت بھیانک ہے مگر ظالم اس سے کہیں خوفناک اور بھیانک ہے"[6]

افسانہ کے آغاز میں میکسم گورکی کا یہ قول دیا ہوا ہے:

"اگر مقدس حق، دنیا کی متجسس نگاہوں سے اوجھل کر دیا جائے تو رحمت ہو اس دیوانے پر جو انسانی دماغ پر سنہرا خواب طاری کر دے"[7] افسانے کی فضا میں شعریت گھلی ہوئی ہے اور ٹالسٹائی کی طرح خطابت بھی، مگر زمین و زماں جانے پہچانے اور مانوس ہیں۔ "آواز اس کنوئیں کے قریب سے بلند ہو رہی ہے جس میں آج سے کچھ سال پہلے لاشوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے دماغ میں جلیانوالہ باغ کے خونی حادثے کی ایک تصویر کھنچ گئی۔"[8] افسانے کا سب سے زیادہ جذباتی حصہ اس دیوانے شاعر کی تقریر کا ہے، جس میں نعرے کا ہیجانی خروش، افسانویت پر غالب آگیا ہے۔ "انقلابی سماج کے قصاب خانے کی ایک بیمار اور فاقوں مری بھیڑ بہیں، وہ ایک مزدور ہے تنومند، جو اپنے آہنی ہتھوڑے کی ایک ضرب سے ہی ارضی جنت کے دروازے بند کر سکتا ہے۔ اس کی لہریں بڑھ رہی ہیں، کون ہے جو اب اس کو روک سکتا ہے۔ یہ بند باندھنے پر نہ رک سکیں گے۔"[9] منٹو کو غلامی سے نفرت تھی، غلام بنانے والوں اور کمتر سمجھنے والوں سے نفرت تھی اور اس لئے انگریزوں سے نفرت تھی اس کا تخلیقی اظہار تو پوری توانائی کے ساتھ 'نیا قانون' میں ہوا مگر 'آتش پارے' کی 'خونی تھوک' میں بھی استاد منگو کا سا شعلہ انتقام رقصاں ملتا ہے۔ متوسط طبقے کے دو نوجوان تعلق اور بے تعلقی کی ملی جلی فضا میں اسٹیشن پر غربت، بدحالی اور غلامی پر مکالمہ کر رہے ہیں کہ ایک انگریز صاحب نے ایک دیسی قلی کو ٹھوکر مار کے گرا دیا۔ قلی نے اپنی جان کی قیمت دس روپے لگتے دیکھ کر صاحب کو اپنے قریب بلایا اور "منہ سے خون کے بلبلے نکالتے ہوئے کہا 'میرے پاس بھی کچھ ہے۔۔ یہ لو' یہ کہتے ہوئے اس نے مسافر کے منہ پر تھوک دیا۔ تڑپا اور پلیٹ فارم کی آہنی چھت کی طرف مظلوم نگاہوں سے دیکھتا ہوا خالد کی گود میں سرد ہو گیا"[10] یہ امر معنی خیز ہے کہ 'تماشا' کا مرکزی کردار یا ناظر بھی خالد ہے 'افسانے کے اختتام پر جذباتی مکالمے ادا کیے گئے ہیں۔ جب جج ملزم کو معمولی جرمانے کے بعد بری کر دیتا ہے مگر ان سے ایک استحصالی اور ریاکار نظام معاشرت و قانون کا نقشہ ضرور کھینچ جاتا ہے۔ "قانون کا قفل صرف طلائی چابی سے کھل سکتا ہے۔۔۔۔، مگر ایسی چابی ٹوٹ بھی جایا کرتی ہے "[11] 'انقلاب پسند' آتش پارے کا سب سے کمزور افسانہ ہے اس میں بے پناہ جذباتیت اور نیم رس خطابت ہے۔ البتہ طاقت کا امتحان'، 'جی آیا صاحب' اور چوری موثر افسانے ہیں 'طاقت کا امتحان'، متوسط طبقے کی ایسی بے دردی کی کہانی ہے جو نچلے طبقے کی بھوک سے لطف لیتے لیتے ایک مزدور کو موت کی نیند سلا دیتی ہے، جب کہ 'جی آیا صاحب' ایک چھوٹے بچے قاسم کی دردناک کہانی ہے جس کا مالک بے رحم اور خود غرض ہے۔ ننھا قاسم اپنی انگلیوں کو زخمیوں کر کے عارضی طور پر کام سے بچنے کی سبیل پیدا کرتا ہے مگر بلآخر معذور ہو کر ہسپتال میں زندگی کی آخری سانسیں گننے لگتا ہے۔ (افسانوی مجموعے 'دھواں' میں اس افسانے کے عنوان میں ہی تبدیلی نہیں انجام کو بدل دیا گیا ہے مگر 'معذوری' وہاں بھی موجود ہے)۔ فنی اعتبار سے 'چوری' زیادہ پختہ افسانہ ہے۔ ایک بوڑھا بچوں کو اس لمحے روداد سناتا ہے۔ جب محرومی اور افلاس کے ساتھ ساتھ مطالعے کے شوق سے مجبور ہو کر اس نے کتاب چرائی تھی اور پکڑا گیا تھا۔ تاہم وہ بچوں سے بعد کی چوریوں کے بارے میں کہتا ہے۔ کہ ان پر اسے فخر ہے۔ "کیونکہ ہر وہ چیز جو تم سے چرائی گئی تمہیں حق حاصل ہے کہ اب اسے ہر ممکن طریقے سے اپنے قبضے میں لے آؤ مگر یاد رہے کہ تمہاری یہ کوشش کامیاب ہونی چاہیے ورنہ ایسا کرتے ہوئے پکڑا جانا اور اذیتیں اٹھانا عبث ہے "[12] اگرچہ وارث علوی نے منٹو کا فن، حیات و موت کی آویزش میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ "ماتمی جلسہ واحد سیاسی کہانی ہے جو سلیقہ مندی سے لکھی گئی ہے "[13] تاہم 'نیا قانون'

اردو کے شاہکار افسانوں میں سے ہے۔ یہ افسانہ ۱۹۳۸ء کے 'ہمایوں' میں شائع ہوا اور اس میں برطانیہ کی ان آئینی مراعات پر زہر خند کی برق پاشی کی گئی ہے جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت نو آبادی کی رعایا کو دی گئی تھیں۔ اس افسانے میں منٹو کے سیاسی، سماجی شعور میں نفسیاتی شعور اور فنی ریاضت و معروضیت گھل مل گئے ہیں۔ استاد منگو عالمی ادب کے زندہ جاوید کرداروں میں سے ہے، وہ برصغیر کے معصوم انسانوں کا نمائندہ ہے جو غلامی اور استحصال سے نفرت تو کرتے ہیں مگر اس کے اظہار کے لیے مناسب توقع کی تلاش میں رہتے ہیں پھر ان کی خبر اور بے خبری سے زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا ہاں مگر ان کے خواب اور تعبیر میں بہت فاصلہ ہوتا ہے۔ "استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔"[14] منٹو نے فسادات کے امن سیاسی، جذباتی اور ذہنی دھچکوں کو فن کے ایک تجربے کی شکل میں اپنے افسانوی مجموعہ "سیاہ حاشیے" میں پیش کیا ہے۔ اس میں قتل، عصمت دری، لوٹ مار، پولیس کی بدعنوانی جیسے موضوعات کو طنز و مزاح کے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ جس سے انسان کی حیوانیت سامنے آجاتی ہے۔ تقسیم، مناسب کاروائی، کرامات، جیلی، تعاون، حلال اور جھٹکا، مزدوری، پٹھانستان، گھاٹے کا سودا، صفائی پسند، الہنا، ہمیشہ کی چھٹی، آرام کی ضرورت، ساعت شیریں وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اس مجموعے میں تیس سے زائد کہانیاں شامل ہیں۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ انتہائی مختصر افسانچے ہیں۔ ان افسانچوں میں منٹو نے انسان کو یا تو ظالم دکھایا یا مظلوم۔ اس نے ظالموں کو داد دی ہے نہ مظلوموں سے ہمدردی کی ہے اس نے نیک بد کا فیصلہ اپنے قاری پر چھوڑا ہے ان کا افسانہ "ساعت شیریں" اس کی عمدہ مثال ہے۔ "اطلاع موصول ہوئی ہے کہ مہاتما گاندھی کی موت پر اظہار مسرت کے لیے امرتسر، گوالیار اور بمبئی کئی جگہ لوگوں میں شیرینی بانٹی گئی"[15]

منٹو کے ان افسانچوں میں غصے، رحم یا نفرت کے جذبات نہیں ہیں۔ بلکہ اس نے زندگی میں حیرت واستعجاب کے پہلوؤں کو ابھارا ہے۔ وہ طنزیہ مسکراہٹ سے یہ بتاتا ہے کہ انسان میں بربریت پیدا ہو جانے پر بھی مکمل انسانیت ختم نہیں ہوتی۔ سیاہ حاشیے ایسے افسانچوں کا مجموعہ ہے جو صرف فسادات پر لکھے گئے ہیں۔ ان افسانچوں میں فسادات کے دوران پیش آنے والے واقعات کو چن چن کر بھرپور طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ "الہنا" میں لکھتے ہیں:

"دیکھو یار تم نے بلیک مارکیٹ کے دام بھی لیے اور ایسا ردی پٹرول دیا کہ ایک دکان بھی نہ جلی"[16]

"آرام کی ضرورت" میں لکھتے ہیں:

"مرا نہیں۔۔۔۔۔۔ دیکھو

ابھی جان باقی ہے"

رہنے دو یار۔۔۔۔۔۔۔

میں تھک گیا ہوں۔"[17]

"سیاہ حاشیے" کے یہ افسانے انتہائی مختصر ہونے کے باوجود اپنے اند ایک مکمل کہانی سموئے ہوئے ہیں۔ ظلم و بربریت کی کہانی انسانیت کے پستی کی طرف سفر کی کہانی اور یہ منٹو کے ہی فنکارانہ ذہن کا کمال ہے کہ وہ اس قدر اختصار میں بھی پوری داستان قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ انکا افسانچہ "رعایت" ظالم کی بے رحمی اور مظلوم کی بے بسی کی اک مکمل داستان ہے۔

"میری آنکھوں کے سامنے
میری جوان بیٹی کو نہ مارو"
"چل اسی کی مان لو۔۔۔۔۔
کپڑے اتار کر ہانک دو ایک طرف۔"[18]

"سیاہ حاشیے" کے علاوہ بھی اس موضوع پر کئی افسانے ہمیں منٹو کے دوسرے افسانوں میں ملتے ہیں۔ جن میں فسادات کی کھسوٹ، اغوا اور قتل وغارت کے پس منظر میں انسانی زاویہ نظر کی وضاحت کی گئی ہے منٹو نے فسادات پر افسانے لکھ کر انسان کے اندر کے وحشی انسان کو بے نقاب کیا ہے۔ انہوں نے دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ فسادات میں عورتوں پر ہوئے مظالم کی داستان ایک گواہ کے طرح پیش کی ہے۔ اس ضمن میں "موذیل، ٹھنڈا گوشت، کھول دو محبوس عورتیں" ان کے شاہکار افسانے ہیں۔ افسانہ 'موذیل' ایک یہودی فاحشہ عورت کی کہانی ہے۔ جو انتہائی گرے ہوئے کردار کی مالک ہے۔ جو بظاہر اک بہت بے باک اور بے حس عورت ہے جو محبت اور ہمدردی جیسے جذبات سے ناآشنا ہے۔ لیکن فسادات کے موقع پر اس کا اک نیا روپ سامنے آتا ہے۔ وہ اپنے چاہنے والے ترلوچن سنگھ کی منگیتر کو بچانے کے لیے اپنی جان تک دے دیتی ہے۔ افسانہ موذیل میں منٹو نے انسانیت کی پستی کی انتہا دکھائی ہے۔ کہ خون میں لتھڑی ہوئی بے بس عورت کو دیکھ کر بھی بلوائیوں کی حوانیت ختم نہ ہوتی اور موذیل کا برہنہ جسم ان کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ افسانے کے اختتام پر جب ترلوچن سنگھ اپنی پگڑی سے موذیل کے برہنہ جسم کو ڈھانپنے کی کوشش کرتا ہے تو موذیل کا جملہ "لے جاؤ اس کو۔۔۔۔۔۔۔ اپنے مذہب کو۔۔۔۔۔" مذہب پر منٹو کا شدید وار ہے اس بڑا اور مذہب پر کیا ہو گا جو ظاہر کا پرستار ہے۔ جس میں محبت اور ہمدردی نہیں جو انسانیت کا محافظ نہیں۔ موذیل بظاہر ایک برے کردار کی عورت ہے۔ لیکن وہ اپنی جان دے کر اپنا مذہب اور قوم کی تخصیص کے لیے لوگوں کی جان بچاتی ہے اور انسانیت کا حق ادا کرتی ہے۔ نگہت ریحانہ لکھتی ہیں: "وہ طوائف کے جسم سے لطف اندوزی کا تصور کیے بغیر اس کے دل کے نہاں خانوں اور اس کے ذہن کی گہرائیوں میں اتر کر درد و کرب کا سراغ لگاتے ہیں اور اس میں ان انسانی قدروں کا سراغ لگاتے ہیں جو ایک نارمل عورت میں ہوتی ہیں۔ تب انہیں پتہ چلتا ہے کہ کوٹھے والیاں شریف گھرانوں کے عورتوں سے زیادہ حساس، جذباتی اور وفاشعار ہوتی ہیں اور اس کی عمدہ مثال موذیل میں ہے"[19]

افسانہ "کھول دو" فسادات کے حوالے سے ایک کامیاب کہانی ہے فنی اعتبار سے اس کہانی کے کامل ہونے میں کوئی شبہ نہیں اس کہانی میں منٹو نے فسادات کے جس پہلو کو موضوع بنایا ہے وہ اس انتشار، آپا دھاپی اور بد عنوانیوں میں اک تلخ حقیقت ہے۔ "کھول دو" دل دہلا دینے والا افسانہ ہے۔ جب باپ اپنی عزیز اور لخت جگر بیٹی کو فسادیوں کے پنجے سے بازیاب کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ تو اس کی جان بچانے کی خاطر اس کو ہسپتال میں بھرتی کیا جاتا ہے جہاں ڈاکٹر کسی سے کھڑکی کے بارے میں کہتا ہے کھول دو۔ لفظ کھول دو کا سننا تھا کہ لڑکی نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی لاشعوری طور پر اپنے باپ اور ڈاکٹر کے سامنے اپنا ازار بند کھولنے لگتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس معصوم بے بس، اور مجبور لڑکی کے ساتھ معاشرے کے ان سفاک بھیڑیوں نے کیسا بھیانک ظلم و جبر کیا ہو گا۔ کہانی کے آخری حصے میں منٹو نے جن واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ موضوع کے اعتبار سے ایسے تلخ حقائق ہیں جن سے آنکھیں چار کرنے کی ہمیں سکت نہیں۔ اس کیفیت میں درد، کسک، تلخی اور ہمدردی کے جذبات اس طرح ملے جلے نظر آتے ہیں کہ ذہن شعوری کوشش کے باوجود اس تاثر سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا اور یہ مصنف کی

سب سے بڑی کامیابی ہے اس افسانے میں منٹو نے انسان کو گھناؤنے روپ کو بے نقاب کیا ہے۔ کہ جسے دیکھنے کی تاب ہم میں نہیں۔ منٹو نے بڑی سفاکی سے فسادات کا ایک دردناک اور خوفناک پہلو ہمارے سامنے رکھا ہے۔ بقول ڈاکٹر فردوس انور قاضی:

"کھول دو دکھ کی ایسی کہانی ہے جو انسان کی انسانیت پر ایک کاری زخم کی حیثیت رکھتی ہے۔"[20]

ہر دور میں انسانی وحشت کا نشانہ بننے والی حوا کی بیٹی کو تقسیم ہند کے موقع پر بھی پامال کیا گیا ہے اور غیرت مند مردوں نے بلا تخصیص لاکھوں مسلمان، سکھ اور ہندو عورتوں کو ہر ہر طرح سے وحشت کا نشانہ بنا کر مردانگی کے جشن منائے۔ وہ صنف نازک جس کے وجود سے کائنات میں رنگ تصور کیا جاتا رہا۔ جو شاعری اور فنون لطیفہ کا ایک اہم جزو سمجھی رہی۔ ان حالات میں دہشت، بربریت، اور ہوس کا شکار ہوتے دیکھ انسانیت خون کے آنسو رونے پر مجبور ہوگئی۔ یہ وہ جنسی گھٹن تھی جس نے انسان کے اندر چھپی ہوئی گھٹن کو آشکار کر دیا۔ وہ گھٹن جو بظاہر ترقی یافتہ کہلانے کے باعث کھل کر سامنے نہ آسکی مگر تاریخ گواہ ہے جب یہ خونی کھیل رچایا گیا تو انسانیت کی تمام حدوں کو پامال کرتے ہوئے ظلم و ستم کا بازار بلا شرکت غیرے سرانجام دیا گیا۔ سعادت حسن منٹو نے اپنے افسانوں میں کھول دو، شریفن، ڈارلنگ، عزت کے لیے، بسم اللہ، محبوس عورتیں، وغیرہ میں ایسی خواتین کے کرب کو اجاگر کیا ہے۔ تقسیم ہند کے دوران ان دونوں فریقین نے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس کمزور طبقے کو مٹی میں ملانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی افسانہ "محبوس عورتیں" ان ہزاروں بے بس، لاچار اور مجبور عورتوں کا المیہ یہ ہے کہ جن کی زندگیاں سیاست کے اکھاڑے بازی اور مذہب کے جنون کی نظر ہو گئیں۔ یہ ان پچاس ہزار عورتوں کی کہانی ہے۔ جو فسادات کے دوران بے لگام شہوانیت اور مخالفین کی شہزوری کا نشانہ بنیں۔ یہ ان مظلوم عورتوں کی داستان ہے جنہیں بازیابی کے بعد اپنوں نے قبول نہ کیا اور ان بچوں کا المیہ ہے جو کئی بے بس عورتوں نے اپنی مجبور کوکھ سے پیدا کیے۔ افسانے کے اختتام پر منٹو نے ایک سوال اٹھا کر انسانیت اور معاشرے کے دوہرے معیار اور دوغلے پن پر زوردار طمانچہ رسید کیا ہے وہ لکھتا ہے:

"ہم جانور پال سکتے ہیں۔ حیوانوں کو اپنے سینے سے لگا سکتے ہیں کیا ہم ان عورتوں اور ان بچوں کو اپنے گھروں میں جگہ نہیں دے سکتے"[21] اس طرح افسانہ "ٹھنڈا گوشت" بھی فسادات کے پس منظر میں ایک جنسی مسئلہ ہے۔ لیکن باوجود اپنی عریانی کے فنی اعتبار سے ایک مکمل افسانہ ہے۔ منٹو اس افسانے کی وجہ سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ یہاں تک کہ اس افسانے کی وجہ سے جنس نگاری کا الزام لگا کر منٹو پر مقدمہ چلایا گیا۔ امرتا پریتم اس حوالے سے لکھتی ہیں: "منٹو نے ان لوگوں کو دیکھا جن کی آتما مر چکی ہوتی ہے۔ اور وہ زندہ لاشیں جہاں سے بھی گزر جائیں اپنے پیچھے عجیب سڑاند چھوڑ جاتی ہیں۔ اور منٹو نے جب ان کے ٹھنڈا گوشت کا ذکر کیا گیا تو اپنی ہی سڑاند سے گھبرانے والوں نے منٹو کو مجرم کہا"[22]

بظاہر وہ بیہودہ اور جنسی گمراہی کی ترغیب دینے والا یہ افسانہ بباطن انسانیت کے دوغلے پن اس کی دورنگی اور فریب کاریوں کا آئینہ ہے۔ فسادات کے موضوع پر فکشن کا ذکر سعادت حسن منٹو کے حوالے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ شاید شروع بھی نہیں ہو سکتا۔ منٹو بلاشبہ ایک ایسے تخلیق کار ہیں جن کے فسادات پر لکھی گئی کہانیاں اپنی تلخی، بے رحم تصویر کشی اور ناقابل تردید سچائی کے سبب انسانی صورت حال کی بہترین عکاس ہیں۔ ان کی کہانیوں میں بلاواسطہ طور پر سیاست پر بھی تبصرہ ہے مگر ان کا طرہ امتیاز ہیجان انگیز حالات اور سفاک واقعات میں گھرے انسان کی نفسیات کی پیشکش ہے۔ افسانہ "سہائے" میں وہ فسادات کے متعلق اپنے آغاز میں لکھتے ہیں: یہ مت کہو ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں۔۔۔ یہ کہو کہ دو لاکھ

انسان مرے ہیں۔ اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔ ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے والے اور مرنے والے کسی کھاتے میں نہیں گئے۔"[23]

جُگل اور ممتاز اور سہائے یہ تینوں کردار فسادات کے عہد کے نمائندہ ہیں۔ منٹو نے فسادات کے دوران پیدا ہونے والے جذباتی الاؤ کو ان کرداروں کے ذریعے پیش کیا کی کس طرح برسوں کے بنائے رشتے ٹوٹ گئے۔ محبت کی جگہ نفرت نے لے لی اور ایک دوسرے پر جان نچھاور کرنے والے اک دوسرے کی جان کے دشمن بن گئے۔ افسانہ "گورمکھ سنگھ کی وصیت" اس پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں منٹو نے ان المیے کو ابھارا ہے جس نے محسنوں کے احساس فراموش کرا دیے۔ سنتو کھ سنگھ کے سامنے اس کے محسن کا گھر جل کر خاک ہو گیا۔ اس کے محسن کی بیٹی اپنی عصمت گنوا بیٹھی اثاثے جل کر بھسم ہو گئے۔ لیکن اس کا سانحہ کا سنتو کھ سنگھ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ نفرت کی آگ اتنی شدید تھی کہ وہ اعلی انسانی اقدار، صلہ رحمی اور دکھ درد میں شرکت کے جذبے کو بھی نگل گئی۔ لوگوں نے معذوروں اور حالات کے ستائے ہوئے لوگوں کو بھی معاف نہ کیا اور ظلم بربریت کا نشانہ بنایا۔ تقسیم ہند ایک المناک سیاسی حادثہ تھا۔ اس عہد کے لکھنے والوں کے یہاں اخوت اور محبت کے رشتوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا عمل دکھائی دیتا ہے۔ انسان اپنی خود غرضی اور مذہبی تعصب کے باعث نفرت کی انتاہی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ افسانہ نگاران حالات سے بری طرح متاثر ہوئے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں برصغیر نے انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت دیکھی۔ ایک کروڑ بیس لاکھ انسانوں نے ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان ہجرت کی۔ یہ ہجرت لاشوں سے اٹی گاڑیوں اور خون آلود راستوں کے ذریعے ہوئی۔ تقسیم ہند نے دس لاکھ انسانوں کو لقمہ اجل بنتے ہوئے دیکھا اس پس منظر میں تخلیق کیا گیا ادب اردو کی ادبی تاریخ کا غیر معمولی اہمیت کا حامل باب ہے۔ یہ ادب سرحدوں کے دونوں طرف آگ خون کی گرم بازاری، انسانی شرف و وقار کی تاراجی، بستیوں کو مسمار کر دیے جانے، انسانوں کے قتل عام، خواتین کی آبروریزی اور لاکھوں انسانوں کی بے سروسامانی کے واقعات کا ایک ایسا دلخراش آئینہ ہے۔ جس کی ادبی قدر و قیمت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کہ فسادات کے موضوع پر لکھنے والے بعض تخلیق کاروں نے فنی نقطہ نظر سے بھی وہ شاہکار تخلیق کر دیے۔ جو ادب کو عالمی ادب کے برابر لے آئے۔ سعادت حسن منٹو کا افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اردو ادب کی ایسی ہی ایک دین ہے جو عالمی ابیات کو سرفراز کرنے کا سبب بنی۔ تقسیم کے پس منظر میں لکھا ان کا یہ افسانہ ایک کلاسیک کی حثیت رکھتا ہے۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" بظاہر ہر ہندوستان اور پاکستان کے پاگل خانوں کے تبادلے کی کہانی ہے۔ مگر دراصل کہانی میں منٹو نے تقسیم کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت اور دونوں ملکوں کی مضحکہ خیز پالیسوں کو قلمبند کیا ہے۔ انہوں نے اس کہانی میں انسان کی اپنی مٹی سے محبت کی شدت کو بھی بیان کیا ہے۔ وہ محبت جو سیاست اور مذہب کی لگائی ہوئی باڑوں اور دیواروں کو ماننے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کہانی کے مرکزی کردار کا اصل نام بشن سنگھ بن جاتا ہے۔ وہ اس ملک میں جہاں اسکا وطن ٹوبہ ٹیک سنگھ نہیں تھا، جانے سے انکار کر دینا ہے اور موت کو گلے لگالیتا ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں انسانی محبت کا عکس نظر آتا ہے۔ بھائی چارہ جو انسان کی پہچان ہے۔ افسانے کے آخری پیروں میں سے ایک میں فضل دین بشن سنگھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ "اب سنا ہے تم ہندوستان جا رہے ہو۔ بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سے میرا اسلام کہنا اور بہن امرت کور سے بھی۔ بھائی بلبیر سنگھ سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے۔۔۔۔۔ میرے لائق جو خدمت ہو کہنا میں ہر وقت تیار ہوں اور یہ تمہارے لیے تھوڑے مرنڈے لایا ہوں۔"[24]

یہ افسانہ تقسیم کے دو تین سال بعد کے پس منظر میں لکھا گیا اس افسانے میں تقسیم کے بعد دونوں حکومتوں کی لغو پالیسیوں کے نتیجے میں ہونے والے انسانی المیہ کو بہت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں منٹو نے پاگلوں کی زبان سے وہ کہلوایا ہے جو ایک صحیح الدماغ شخص کہنے کی جرات نہ کر سکتا تھا۔ ان کے افسانے کے پاگل خانے دراصل دونوں ملکوں کا استعارہ ہیں اور ان میں رہنے والے پاگل دونوں ملکوں کے عوام ہیں۔ جنہیں ہجرت کے آلام و مصائب سے گزرنا پڑا۔ فسادات کی پیدا کی ہوئی پریشان کن فضا میں یہ ایک ایسا موضوع ہے جسے بظاہر آسانی سے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ منٹو کے ہم عصروں میں سے کسی نے بھی اس پہلو پر توجہ نہیں دی اگر توجہ دی بھی تو اسے اس انداز سے محسوس نہ کیا کہ ان کے افسانے کا موضوع بن جاتا۔ فسادات اور پاگل بظاہر بڑی بے جوڑ سے بات ہے لیکن منٹو کی یہ خاصیت ہے کہ وہ معمولی بات کو بھی غیر معمولی بنا دیتا ہے۔ یہ کہانی انتشار کے بعد کی ایسی گونج ہے جو اپنی انفرادیت کے ساتھ ساتھ نمایاں طور پر ادب میں سنائی دیتی ہے۔ نگہت ریحانہ لکھتی ہیں:

"منٹو نے بڑے لطیف اشاروں سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ اس چار دیواری سے باہر بھی خطرناک پاگلوں کی کمی نہیں۔ جن کی تخریبی ذہنیت اور طاقت نہ صرف زمینوں کے بٹوارے کر دیتی ہے۔ بلکہ شخصیتوں کو بھی دو نیم کر دیتی ہے دلوں کے بٹوارے کر دیتی ہے اور تعلقات میں دراڑیں ڈال دیتی ہے۔"[25]

اسی طرح منٹو کا ایک افسانہ "مزدور" فسادات کے پس منظر میں غربت افلاس اور اس سے پیدا ہونے والے انسانی کرب اور مجبوری کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔ رام کھلاون، ہرنام کور، ڈارلنگ، عزت کے لیے، وہ لڑکی اور انجام بخیر وغیرہ۔ وہ افسانے ہیں جو اپنے کرداروں کے ذریعے تقسیم کے پس منظر میں انسانی سفاکیت کی روداد بیان کرتے ہیں۔ آخری سلوٹ، ٹیٹ وال کا کتا اور یزید ایسے افسانے ہیں جو تقسیم کے پس منظر میں کشمیر کے تنازعہ پر لکھے گئے۔ منٹو تقسیم اور فسادات کو اپنے لاشعور سے کبھی نہ نکال سکا۔ برصغیر کی تقسیم میں عجلت تھی یا کوئی خلا؟ حیوانیت نے انسانیت کو بے بس کر کے رکھ دیا انسانیت پر جو زخم لگے ان میں بڑا زخم یہ ہے کہ ایک زمین پر صدیوں تک ساتھ رہنے والے باسیوں نے ہی ایک دوسرے کا خون کیا، آبروریزیاں کیں اور مال و اسباب لوٹا۔ مذہب کے نام پر انتہائی بے مذہب لوگوں نے، جن کا مذہب ہوس، لالچ، حرص، زمین اور دوسروں کا مال تھا ،اپنے جیسے انسانوں پر حیوان بن کر ٹوٹ پڑے۔ منٹو نے ان زخموں کو اپنے دل پر لگا محسوس کیا اور پھر یہ محسوسات موت کی وادی تک اس سے الگ نہ ہو سکے۔ بقول سید وقار عظیم: "منٹو نے اپنے گردوپیش کی دنیا کے ان گنت پہلوؤں کو دیکھا ہے اور جو کچھ دیکھا ہے اسے ایک اہم فرض کی طرح افسانے کا موضوع بنانے کی کوشش کی ہے۔"[26] بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی: "اس کا احساس اتنا شدید ہے۔ اس کی نظر اتنی گہری اور اس کا تخیل اتنا بلند ہے کہ وہ زندگی کے سمندر سے حقائق کے موتی نکال ہی لاتا ہے۔"[27] ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں: "سعادت حسن منٹو اور اس کے افسانے بلاشبہ اردو ادب میں ایسے آئینے ہیں۔ جن میں ان کے عہد کی تصویر نظر آتی ہے۔"[28]

حاصل کلام

یوں تو 1947 سے 1955 تک ہجرت و فسادات سے متعلق افسانوں کی بہتات دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن تقسیم کے موضوع پر لکھے گئے منٹو کے افسانے فنی اعتبار سے اپنے فن کی معراج سے تعبیر کیے جاسکتے ہیں۔ منٹو نے فسادات کے موضوع پر بہت سے افسانے تخلیق کیے۔ منٹو بنیادی طور پر حقیقت نگاری کے دبستان کا نمائندہ افسانہ نگار ہے۔ اس کے بیشتر افسانوں میں زندگی کی وہی تصویر کشی نظر آتی ہے جو اس نے معاشرے میں دیکھی۔ فسادات کے حوالے سے منٹو کے افسانے اس لیے بھی اہم ہیں کہ

ان کا انداز معروضیت لیے ہوئے ہے۔ وہ کسی مذہب کے طرف دار نہیں۔ وہ انسانیت پر یقین رکھتے ہیں۔ انہوں نے فسادات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس درد کو خود محسوس کیا۔ فسادات کے موضوع پر بہت سا ادب تخلیق ہوا لیکن سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں فسادات کی جو حقیقی تصویر نظر آتی ہے وہ کہیں اور دکھائی نہیں دیتی۔ منٹو کے افسانے موضوعاتی اعتبار سے اپنے عہد کی وہ تصویریں پیش کرتے ہیں جہاں انسان اور انسانیت کی قبائیں تار تار ہو جاتی ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں ہمیں فسادات اور تقسیم ہند کا عہد سانس لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ تقسیم کے موضوع پر لکھا گیا منٹو کا ہر افسانہ فنی اعتبار سے مکمل شاہکار ہے نیز حقیقت پر مبنی انتہائی چبھتا سوال ہے جس کے جواب کے لیے انسانیت کے گریبان میں جھانکنا پڑے گا۔

References

[1] Hakeem Tariq Mehmood Chughtai, 1947 ky mazalim ki kahani khud mazloumon ki zubani (Lahore: Ilm o Irfan publishers 2003), p30.

[2] Farmaan Fateh Poori, Urdu ka afsanwi adab (Lahore: Aalmeen publications 1988), p127.

[3] Nighat Rehana, urdu mukhtasir afsana funi o takneki mtala (Dehli: Dehli Clasical 1986), p169.

[4] Saadat Hassan Manto, Tamasha, mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers 2006), p23.

[5] Saadat Hassan Manto, Tamasha,mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers 2006), p24.

[6] Saadat Hassan Manto, Deewana shayr, mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers 2006), p32.

[7] Saadat Hassan Manto, Deewana shayr, mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers 2006), p32.

[8] Saadat Hassan Manto, Deewana shayr, mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers 2006), p32.

[9] Saadat Hassan Manto, Deewana shayr, mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers 2006), p33.

[10] Saadat Hassan Manto, Naya qanoon, mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers 2006),p78.

[11] Saadat Hassan Manto, Deewana shayr, mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers2006),p34.

[12] Saadat Hassan Manto, Chori, mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers2006),p110.

[13] Waris Alvi, Manto ka fun hayat o mot ki aamezish,mashmola, Manto ki afsana nigari (Lahore:oriental collage laibrary),p,n.

[14] Saadat Hassan Manto, Naya qanoon, mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers 2006), p79.

[15] Saadat Hassan Manto, Saat shereen,mashmola,Manto ky so afsany(Lahore:Aslam Asmat printers2006),p379.

[16] Saadat Hassan Manto, Alahna, mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers 2006), p379.

[17] Saadat Hassan Manto, Aram ki zrorat, mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers 2006), p379.

[18] Saadat Hassan Manto, Reayat, mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers 2006), p377.
[19] Nighat Rehana, Urdu mukhtasir afsana funi o takneki mtala (Dehli: Dehli Clasical1986), p180.
[20] Saadat Hassan Manto, Khol do, mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers 2006), p134.
[21] Saadat Hassan Manto, Mehboos ortyn, mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers2006), p776.
[22] Amrta Pretam,"Seah Lateef"mahnama Harf e Jafer (Faisal Abad: shumara April, May 2007), p18.
[23] Saadat Hassan Manto, Sahay, Mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers 2006), p390.
[24] Saadat Hassan Manto, Tobah tek singh, mashmola, Manto ky so afsany (Lahore: Aslam Asmat printers 2006), p47.
[25] Nighat Rehana, Urdu mukhtasir afsana funi o takneki mtala (Dehli: Dehli Clasical 1986), p176.
[26] Waqar AzeemSyed, naya afsana (Ali garrh: Ali garrh University educational book house), p160.
[27] Doctor Ibadat Brelvi, Afsana or afsany ki tnqeed (Lahore: idara adab tanqeed 1989), p189-190.
[28] Doctor Saleem Akhter, Afsana or afsana nigar tnqedi mtala (Lahore: Sang Meel publications 1991), p147.